

اسلام کا شورائی نظام

مولانا وصی مظہر ندوی

[علمی حلقوں میں اس مسئلہ پر وقتاً فوقتاً بحث کی جاتی رہی ہے کہ کیا اسلامی مملکت کا سربراہ ارکان شورائی کی اکثریت کے فیصلے کو از روئے شریعت مسترد کرنے کا مجاز ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں حال ہی میں ایک مضمون دمشق کے مشہور مجلہ "حضارۃ الاسلام" میں ڈاکٹر حسن ہویدی کے قلم سے شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے قریب قریب وہ سارے دلائل جمع کر دیئے ہیں جو امیر کو ارکان شورائی کے فیصلے کو مسترد کرنے کا اختیار حاصل ہونے کے حق میں دیتے جاتے ہیں۔ اس مضمون کی اشاعت کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ ایک مرتبہ یہ سارے دلائل یکجا سامنے آجائیں تو پھر انہیں بگاہ میں رکھتے ہوئے دوسرا نقطہ نظر پیش کیا جائے۔ مگر اس مضمون کے شائع ہوتے ہی اس کے بارے میں متعدد خطوط موصول ہونے لگے جن میں بعض کا لہجہ خاصاً تند و تیز تھا، چنانچہ اس مضمون کی اشاعت روک دی گئی۔ جماعت اسلامی کے ایک معروف عالم دین مولانا وصی مظہر ندوی نے اس مضمون پر بڑے علمی انداز میں تنقید فرمائی ہے جسے ان صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں میں یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ حسن ہویدی صاحب نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ میرے خیالات نہیں بلکہ یہ ہویدی صاحب کے خیالات ہیں۔ خاکسار نے ان کا ترجمہ جو ترجمان القرآن میں پیش کیا ہے اس کا مقصد ایک مسئلہ کی تفتیح تھا۔ کیونکہ بسا اوقات کسی مسئلہ کی وضاحت کے لیے یہ بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس کے مخالف اور موافق دونوں نقطہ ہائے نظر پیش کر دیئے جائیں۔ ع۔ ح۔ س]

مذکورہ بالا عنوان کے تحت ترجمان القرآن بابت ماہ نومبر ۱۹۷۷ء میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ مضمون

ڈاکٹر حسن ہریدی صاحب کا نتیجہ فکر ہے اور ترجمہ جناب عبد الحمید صدیقی صاحب نے کیا ہے۔ اس مضمون میں جن افکار و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ اسلام کے شورائی نظام کی انتہائی غلط تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہ افکار و نظریات دراصل سلطی مطالعہ اور قلت فکر کا نتیجہ ہیں۔ ترجمان القرآن جیسے علمی رسالہ میں ان کی اشاعت چند در چند غلط فہمیوں کا موجب بن سکتی ہے۔ اس لیے ان سطور میں اسلام کے شورائی نظام کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ مذکورہ بالا مضمون میں اخذ کردہ غلط نتائج پر گرفت بھی کی گئی ہے۔

اسلام نے جس نظام زندگی کی خیر و برکت سے انسانیت کو مالا مال کیا ہے اس کی اساس شورایت پر قائم ہے۔ چنانچہ سورہ شوریٰ میں اس نظام زندگی کے خصائص بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے:

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا
الصَّلَاةَ وَآتَوْا زَكَاةً شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا
رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿۳۸﴾ (شوریٰ - ۳۸)

اور جن لوگوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہی اور جن لوگوں نے نماز کو قائم کیا اور جن کا نظام حکومت باہم مشورے سے چلتا ہے اور جو ہمارے دیتے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت میں مسلمانوں کے نظام زندگی میں شورایت کو مستقل اور غیر منفک وصف ہونے کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں شورایت کی طرح کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اور ان تمام باتوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے جن سے شورایت کو فروغ مل سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی جلی اور وحی خفی کا سلسلہ جاری تھا۔ اس کے باوجود آنحضرت کو حکم دیا گیا:

وَسَاوِدْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۗ (آل عمران: ۱۵۸)

اور (اے نبی) حکومت کے کام میں ان سے مشورہ کر لیا کرو۔ پھر جب تم کوئی فیصلہ کرو تو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے (اس فیصلہ پر عمل کرو)۔

۱۷۰ امر" کا لفظ قرآن مجید میں متعدد معانی میں استعمال ہے۔ ان میں سے ایک معنی نظام حکومت کے بھی ہیں۔ معنی کا تعین قرنیہ سے کیا جاسکتا ہے۔ بعض مثالیں ملاحظہ ہوں: وَاذْهَبْ فِي الْأَمْرِ - وَاطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَاذْهَبْ فِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ - وَالْأَمْرُ إِلَيْكُمْ -

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورے کا حکم اس پس منظر میں دیا گیا کہ آنحضرتؐ بعض صحابہ کے طرز عمل سے خوش نہ تھے۔ اور ان سے مشورہ لینے میں بظاہر انقباض محسوس کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے نبیؐ کی رحمت اور نرم خوئی کو ان صحابہؓ کے لیے شفیع بنایا۔ اور ان کو معاف کر دینے کی ہدایت اس میں انداز میں کی کہ اسے نبی نہ صرف تم انہیں معاف کر دو بلکہ اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کے لیے دعا بھی کیا کرو۔ لیکن ساری ناراضگی کے باوجود ان سے مشورہ ضرور لو۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر مسائل میں صحابہؓ سے مشورہ فرماتے تھے۔ اور اکثریت کے احترام کی عملی نظیریں بھی قائم کرتے تھے۔ لیکن اس آیت کے سلسلہ میں بعض حضرات نے اس عجیب خیال کا اظہار کیا ہے کہ آنحضرتؐ کو مشورہ لینے کا حکم محض صحابہ کرام کی دلجوئی کے لیے تھا، ورنہ آپ کے لیے ان کے مشوروں پر عمل کرنا ضروری نہ تھا۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ آپ کو یہ حکم محض امت کی تعلیم کی خاطر دیا گیا، لیکن یہ دونوں خیال قطعاً غلط ہیں۔ قاضی ابوبکر الجصاصؒ نے ان دونوں خیالات پر سختی سے گرفت کرتے ہوئے لکھا ہے:

وغیر جانزان یكون الا امر
بالمشاورۃ علی جہۃ تطیب نفوسہم
ورفع اقدارہم ولیقندی الامۃ بہ فی
مثلہ لانہ لوکان معلوما عندہم انہم
استفروا عجم و دہم فی استنباط ما
شوروا فیہ وصواب الرأی فیما سئلوا
عندہم لیس لیس ذالک معمولاً علیہ
ولا متلقی منہ بالقبول بوجہ لیس لیس
فی ذالک تطیب نفوسہم ولا رفع لاقدارہم
بل فیہ ایجا شہم و اعلامہم بان آسائہم
غیر مقبولۃ ولا معمولاً علیہا فہذا
تاویل ساقط لا معنی لہا فکیف یسوغ
تاویل من تاویلہ "لیقندی بہ الامۃ"

اور یہ بات درست نہیں ہو سکتی کہ مشورہ کا حکم محض ان کے دل خوش کرنے یا ان کا مرتبہ بلند کرنے کے لیے دیا گیا ہو۔ یا اس لیے ہو کہ امت اس جیسے معاملہ میں اس عمل کی تقلید کرے۔ اس لیے کہ اگر ان کو یہ بات معلوم ہو کہ مشورہ طلب شدہ کے حل کرنے اور صحیح راستے معلوم کرنے میں خواہ وہ اپنی پوری کوشش صرف کر دیں پھر بھی اس پر نہ عمل ہوگا اور نہ اسے کسی نوع سے قبولیت کا شرف حاصل ہوگا، تو اس صورت میں ان کا دل خوش نہ ہوگا اور ان کے مرتبہ کی بلندی تو کیا ظاہر ہوگی البتہ اس سے وہ اور زیادہ بددل ہو جائے اور اس طرح ان کو گویا یہ تباہ دیا جائے گا کہ ان کی آراء نہ قبول کی جائیں گی اور نہ ان پر عمل کیا جائیگا۔ اس لیے قرآن کی آیت کی یہ توجیہ بالکل ناقابل انکساف

مع علماء الامۃ عند هذا القائل بان هذه
المشورة لم يقد شيئاً ولم يعيل بشيء
اشاروا به -

لاحكام القرآن تفسير آیت (وشاورهم فی الامر)

ہے۔ اور نہ اس کا کوئی مفہوم ہے۔ اور اسی طرح امت
کی تقلید کو مقصود بنانے والوں کی رائے بھی کیسے درست
ہو سکتی ہے، کیونکہ ان حضرات کے قول کے مطابق امت
جانتی ہوگی کہ اس مشورہ کا کوئی فائدہ تو تھا ہی نہیں۔
اور نہ صحابہ کے کسی مشورہ پر عمل کیا گیا۔

اس سلسلہ میں ایک عجیب تر بات یہ کہی جاتی ہے کہ فاذا اعزمت فتوکل علی اللہ کا مطلب یہ
ہے کہ مشورہ کرنے کے بعد جب تم اہل شوریٰ کے مشورہ کے خلاف کوئی فیصلہ کر لو تو اہل شوریٰ کی پروا نہ
کرو اور خدا کے بھروسہ پر اپنے فیصلہ پر عمل کر ڈالو۔

حالانکہ اس آیت کا سیدھا سا دھما منہوم یہ ہے کہ مشورہ کے نتیجہ میں جو فیصلہ ہو جائے اسے اللہ
کی تائید حاصل ہوگی اور اللہ کے بھروسہ پر اس پر عمل درآمد کر ڈالنا چاہیے۔ چنانچہ اس آیت کی یہی تفسیر
مفسرین نے کی ہے۔ اور بعض اصحاب سے یہی تفسیر مرفوعاً منقول ہے۔

مشہور مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں،

ای اذا شاورتهم فی الامر وعزمت

علیه فتوکل علی اللہ فیہ۔

یعنی جب تم داسے نبی، ان سے حکومت کے بارے
میں مشورہ کر لو اور کوئی فیصلہ کر کے اس کا عزم کر لو تو
اللہ پر بھروسہ کرو۔

ابن کثیر نے اسی سلسلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ایک مرفوع حدیث بھی نقل کی ہے:

حضرت علی سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ نبی سے
"عزم" کے معنی دریافت کیے گئے تو آپ نے فرمایا

عن علی ابن ابی طالب قال سئل رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن العزم قال

مشاورۃ اهل الدای ثم اتباعهم

"اہل الدای سے مشورہ کرنا اور پھر اس کا اتباع کرنا۔"

پھر اس سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بالکل واضح ہے۔ آپ نے جس مسئلہ میں بھی صحابہ کرام
سے مشورہ طلب کیا اس میں ہمیشہ اکثریت کے فیصلہ پر عمل کیا ہے۔ خواہ وہ فیصلہ آپ کو پسند ہو یا نہ ہو
بلکہ آنحضرت نے اس سے بڑھ کر اپنے اس طے شدہ فیصلہ کا اعلان فرمایا ہے کہ "سینین" یعنی اگر کسی مسئلہ
میں ایک متنفقہ رائے دیں گے تو ان کی رائے کے خلاف حضور کوئی کام نہ کریں گے۔

عن عبد الرحمن بن غنم ان رسول الله
صلى الله عليه وسلم قال لا بى بكر وعمر لو
اجتمعنا فى شورة ما خافتكما -

راحمہ سبحوالا ابن کثیر،

عبدالرحمن ابن غنم سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
نے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر سے فرمایا کہ "اگر تم کسی مشورہ
پر متفق ہو جاؤ تو میں تمہارے مشورہ کے خلاف عمل
نہ کروں گا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ طلب امور میں ہمیشہ اکثریت کی رائے کی کس طرح پیروی کی ہے، اس
کی صرف چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔ غزوہ اُحد کے موقع پر حضور نے صحابہ سے مشورہ طلب کیا کہ دشمن
کا مقابلہ کس طرح کیا جائے، مدینہ میں رہ کر ہی جنگ لڑی جائے یا باہر نکل کر، اس مشورہ کی تفصیل ابن
ہشام نے یوں نقل کی ہے۔

فان رأيتم ان تقيموا بالمدينة وتدموم
حيث نزلوا فان اقاموا بالبشر مقام
وان هم دخلوا علينا قاتلناهم فيها -

تو اگر تمہاری رائے ہو تو ایسا کر لو کہ مدینہ میں قیام
کرو اور ان دشمنوں کو جہاں وہ اترے ہیں وہیں چھوڑ
دو پھر اگر وہ وہاں قیام کریں گے تو نہایت بڑی جگہ
قیام ہوگا۔ اور اگر وہ ہمارے پاس آگئے تو ہم
مدینہ ہی میں ان کا مقابلہ کریں گے۔

لیکن بدر کی لڑائی میں شرکت سے محروم رہ جانے والے نوجوانوں کی اکثریت باہر نکل کر مقابلہ کرنے
پر اصرار کرتی رہی۔ یہاں تک کہ حضور گھر میں داخل ہوتے اور اسلحہ سے بیس ہو کر باہر تشریف لائے۔
ابن ہشام نے آگے مزید تفصیل سے یہ بات واضح کی کہ حضور کو اکثریت کا یہ فیصلہ پسند نہ تھا لیکن
پھر بھی آپ نے اس پر عمل کرنا ضروری سمجھا۔

وقد ندم الناس وقالوا استكرو هنا
رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يكن
لنا ذلك فلما خرج رسول الله صلى الله
عليه وسلم قالوا يا رسول الله استكرو هناك
ولم يكن ذلك لنا فان شئت فاقتد فقال
صلى الله عليه وسلم ما ينبغي لنبى اذ ليس

لوگ شرمندہ ہو چکے تھے اور انہوں نے (آپس میں،
کہا کہ ہم نے رسول کو مجبور کیا حالانکہ ہمارا حق نہ تھا۔
جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو انہوں
نے کہا یا رسول اللہ ہم نے آپ کو مجبور کیا حالانکہ اس
بات کا ہم کو حق نہ تھا۔ اس لیے اگر آپ کی مرضی ہو تو
مدینہ میں ہی ٹھہر جائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب

لامۃ ان یضعها حتی یقاتل -

دیا۔ کسی نبی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ ہتھیار اٹھا لینے کے بعد جنگ کرنے سے پہلے ہتھیار واپس رکھنے

یہ ہے۔ فَاذِ اعْزَمْتُمْ فَتَوَكَّلُوا عَلَى اللَّهِ کی عملی تفسیر۔ یعنی مشورہ کے بعد جو طے ہو گیا اُس پر عمل ہونا چاہیے۔ گھڑی گھڑی فیصلہ تبدیل کرنا اپنی بربادی کو دعوت دینا ہے۔

بعض حضرات نے غزوہ اُحد کے اس واقعہ کی یہ توجیہ کی ہے کہ حضور نے اپنی رائے تبدیل کر کے اکثریت کی رائے سے اتفاق کر لیا تھا، اس لیے یہ اکثریت کا فیصلہ نہیں بلکہ خود حضور کا اپنا فیصلہ تھا حالانکہ ابن ہشام اور دوسرے مؤرخین نے جس طرح اس واقعہ کو نقل کیا ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اکثریت کی رائے کا لحاظ کرتے ہوئے آپ نے یہ فیصلہ قبول کیا تھا۔ حالانکہ آپ خود دل سے اس پر رضی نہ تھے۔ اس لیے جب لوگوں کو حضور کی ناراضگی کا احساس ہوا تو انہوں نے اپنے اصرار پر اظہارِ زنادت کرتے ہوئے اپنی رائے واپس لینے کا خیال ظاہر کیا تو حضور نے جو ابا یہ نہیں فرمایا کہ میں اس فیصلہ سے ناراض نہیں ہوں اور یہ کہ میں نے خود اپنی رائے بدل ڈالی ہے بلکہ آپ نے صرف بار بار فیصلہ بدلنے سے معذوری ظاہر کی۔

اسی طرح غزوہ احزاب و خندق کے موقع پر آپ نے بعض حملہ آور قبائل سے عارضی مصالحت کا ارادہ کیا تاکہ اس طرح کفار کا زور توڑا جاسکے۔ ابتدائی گفتگو بھی ہو گئی۔ اور آنحضرت نے مدینہ کی سپردا کا ایک حصہ دینا بھی قبول فرمایا۔ لیکن آخری فیصلہ سے قبل آپ نے انصار کے اہل الرائے سے مشورہ کرنا ضروری خیال کیا۔ ابن ہشام نے اس واقعہ کی تفصیل اس طرح نقل کی ہے۔

چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کی تکمیل کا ارادہ فرمایا۔ تو لوگوں کے سردار سعد بن معاذ اور (خزرج) کے سردار سعد بن عبادہ کو آپ نے طلب فرمایا اور ان سے صلح معاملہ کا ذکر کیا۔ تو ان دونوں اصحاب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا وہ رسول اللہ اپنے یہ تجویز خود پسند فرماتی ہے کہ ہم اس پر عمل کریں یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم اس کی لازمی

فلما اِداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یفعل بعث الی سعد ابن معاذ وسعد بن عبادۃ فذکر ذالک لهما فقالا لہ یا رسول اللہ امرآ تخبہ فنفتعہ امر شیئا امرک اللہ بہ لا یبدلنا من العمل بہ امر صنعہ لنا قال بل شیئا اصنعہ لکم، فقال سعد بن معاذ واللہ ما لنا بهذا من حاجۃ۔ فقال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانت و
تعمیل کریں۔ یا آپ نے محض ہمارے فائدہ کے لیے
یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ
میں نے یہ کام تمہارے فائدہ ہی کو ملحوظ رکھ کر کیا ہے
تو سعد بن معاذ نے کہا، خدا کی قسم ہم کو اس کی ضرورت نہیں۔۔۔ یہ پُر عزم جواب سن کر رسول نے فرمایا
اچھا! تو جو تمہاری مرضی۔

شورائیت کو فروغ دینے کے لیے اسلام نے تحریر و تقریر کی مکمل آزادی عطا کی ہے۔ جگہ غلط باتوں
پر ٹوکنا اور ان سے روکنا ہر مومن پر واجب قرار دیا ہے۔ اور ظالم اور جابر حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کہنے
کو افضل ترین جہاد قرار دیا ہے۔ تنقید اور محاسبہ کے اس حق کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اور خلفائے راشدین نے
نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی اور سخت سے سخت الفاظ میں گرفت کرنے والوں کو نرمی اور
علم کے ساتھ جوابات دیکر مطمئن کیا۔ جنگ ہوازن کے مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں بعض پُر جوش
انصار نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنیوں کا خیال کیا ہے اور ہم کو محروم رکھا۔ نبی صلی
اللہ علیہ وسلم نے اس الزام کی حقیقت انصار کے جلسہ عام میں واضح کی۔ اور مالِ غنیمت کی تقسیم کی
حکمت بیان کر کے تمام انصار کو مطمئن فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سچو کرنے والے ایک شاعر کے بارے
میں کسی نے مشورہ دیا کہ اس کی زبان کاٹ لی جائے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشورہ کو رد کیا۔
کسی شخص نے حضرت عمرؓ کو نہایت سختی سے کہا "اِنَّكَ اللهُ يَا عمر!" اسے عمرؓ اللہ سے ڈرا حضرت
عبداللہ بن عباسؓ نے اس شخص کو ایسے سخت الفاظ کہنے سے منع کیا تو حضرت عمرؓ نے کہا "اسے کہنے دو
اگر یہ لوگ ہم کو نہ ٹوکیں تو ان میں کوئی بھلائی نہیں۔ اور اگر ہم ان کی بات نہ سنیں تو ہمارے اندر کوئی
خوبی نہیں۔"

بعض حضرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عزیز عمل کو جو آپ نے حدیبیہ میں اختیار فرمایا تھا، میر
کے حق استرداد کے سلسلہ میں قاطع دلیل کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس واقعہ میں اس کی
کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں سربراہِ مملکت اور درج کے سپریم
کمانڈر کی حیثیت سے تشریف رکھتے تھے۔ جنگی حالات میں باہم اور بعض میدانِ جنگ میں سربراہِ مملکت کو
مطلع و جنگ کے وسیع اختیارات ہوتے ہیں۔ اور عین میدانِ جنگ میں شورائی کی پابندی کو نا ضروری نہیں ہونا

کیونکہ اقدامات کی حکمت کو اگر قبل از وقت واضح کر دیا جائے تو ان اقدامات کی افادیت ختم ہو جاتی ہے صلح حدیبیہ کی صورت حال یہی تھی۔ مدینہ منورہ خیبر کے یہود اور مکہ کے قریش دونوں کی زد میں تھا۔ خیبر اور مکہ دونوں سے مدینہ منورہ تقریباً تین سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ اگر ایک دشمن کے خلاف مسلمان لشکر کشتی کرتے تو اندیشہ تھا کہ دوسرا دشمن پیچھے سے آکر اسلامی سلطنت کے پایہ تخت کو روند ڈالے اس لیے ناگزیر تھا کہ دونوں دشمنوں میں سے ایک دشمن سے وقتی طور پر کسی نہ کسی قسم کا معاہدہ ہو جائے۔ یہود سے یہ معاہدہ کسی طرح ممکن نہ تھا اس لیے آپ اشہر حرم میں عمرہ کی نیت سے بغیر اختیار مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوتے۔ خیال یہ تھا کہ کفار اپنی جھوٹی عزت کی خاطر عمرے سے روکیں گے اور آئندہ اپنی مرضی سے آنے دینے کا بہانہ بنائیں گے۔ اس طرح ان سے معاہدہ ہو جائے گا اور ایک طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد یہود کو ختم کرنا آسان ہو جائے گا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء ہی میں اعلان فرما دیا کہ حرم کی عزت کو برقرار رکھنے کیلئے کفار جن شرائط پر بھی معاہدہ کرنا چاہیں گے میں ان شرائط کو تسلیم کر لوں گا۔

یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے معاہدہ میں کفار کی ہر شرط کو منظور کر کے دس سال تک جنگ بندی کا اطمینان حاصل کر لیا اور جوں ہی یہ معاہدہ مکمل ہوا آپ نے فوراً خیبر کا رخ کیا کہ کہیں دشمنوں کو اپنی سیاسی غلطی کا احساس نہ ہو جائے اور وہ اس معاہدے کو غسوخ نہ کر دیں۔ اب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چند آدمیوں کو اس حکمت سے پہلے ہی باخبر کر دیتے تو اول تو یہ پورے لشکر کی بے اطمینانی کا علاج نہ تھا اور دوسرے اس حکمت کے انشاء ہونے کا بھی خطرہ تھا اس صورت میں ممکن ہے دشمن عمرے کی اجازت دے دیتا اور جنگ بندی نہ قبول کرتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے جنگی حالات میں سربراہ اپنی صوابدید سے جو ابدی کا خطرہ مول لے کر اقدامات کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حدیبیہ کی صلح کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے قطعاً مشورہ نہ لیا، اس لیے یہ بات کہنا سرے سے غلط ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شوریٰ یا عام مسلمانوں کی اکثریت کی رائے کے خلاف کیا۔ عین ممکن ہے کہ اس نازک مرحلے پر آنحضرت کی رہنمائی بذریعہ وحی بھی فرمائی گئی ہو۔ آپ کے ان خالصتاً سفیدی اور انتظامی اقدامات پر بعض حضرات نے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا

تو آپ نے ان کو مبہم سا جواب دے کر اپنے اختیارات کی طرف توجہ دلائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ مضطرب تھے اور انہی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے کی ہمت بھی کر ڈالی۔ چنانچہ ابن ہشام نے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

فعلام نعطى الدينية في دينا قال انا
عبد الله ورسوله لن اخالف امره ولن
يضيعنى . . . فكان عمر يقول ما زلت
الصدق واصوم واصلى واعتق من الذى
صنعت يومئذ -

(ابن ہشام،

تو ہم اپنے دین میں وہ بات کیوں قبول کریں۔
آپ نے جواب دیا: میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول
ہوں، میں اس کے حکم کی خلاف ورزی نہ کروں گا،
اور وہ مجھے کبھی برباد نہ ہونے دے گا۔ حضرت عمرؓ کہتے
تھے کہ میں نے حضورؐ سے اُس دن جس طرح گفتگو کی اس
کی وجہ سے میں صدقات، روزوں، نمازوں اور غلاموں
کو آزاد کرنے کے ذریعے مستقل کفارہ ادا کرتا رہا ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجمالی جواب میں یہ بات واضح کر دی کہ میں اللہ کا بندہ ہوں،
اس کی نافرمانی نہیں کروں گا اور سربراہ مملکت کی اطاعت سے نکلنے کی اجازت اسی وقت ہوتی ہے
جب وہ معصیت کا حکم کرے اور آپ نے مزید فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ
اس ذمہ داری میں میری رہنمائی کرے گا اور مجھے کوئی ایسا قدم نہ اٹھانے دے گا جس میں میری بربادی ہو۔
جس وقت معاہدہ صلح نکھا جا رہا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سربراہ کی حیثیت سے معاہدہ اٹلا
کر رہے تھے اس وقت کفار کے نمائندے نے بعض لفظی بحثیں چھیڑیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس
کی ہرکٹ جھتی سے درگزر کر کے تکمیل معاہدہ کی جانب متوجہ رہے۔ اس حالت میں بعض حاضرین نے
کفار کے نمائندے کے مطالبے پر بعض الفاظ میں رد و بدل پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ انہوں
ہے کہ اس واقعہ کو بھی بعض لوگوں نے حق استرداد ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا ہے حالانکہ حضور صلی
اللہ علیہ وسلم ذمہ دار حاضر کی نام نہاد عوامی جمہوریت کے قائل نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ معاہدہ کا متن کوئی
ذمہ دار فرد تحریر کرتا ہے۔ جلسہ عام اس قسم کا متن تیار کرنے کا مجاز کب ہوتا ہے کہ حضور ان اصحاب
کی رائے کے پابند ہوتے جو معاہدہ کا متن تیار کرنے کے سلسلہ میں مشورے دے رہے تھے۔

اسی طرح مانعین زکوٰۃ کے سلسلہ میں حضرت ابو بکرؓ کے اقدام کو بھی بعض لوگ امیر کا حق استرداد

ثابت کرنے کے لیے آخری دلیل تصور کرتے ہیں حالانکہ اس سے زیادہ کمزور اور بودا استدلال ممکن ہی نہیں ہے۔

صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے مملکت کے اختیارِ حکمرانی اور نظامِ دین کے تحفظ کے ذمہ دار تھے۔ یہ بات سرے سے مشورہ طلب نہیں تھی اور نہ کبھی مشورہ طلب ہو سکتی ہے کہ ایک سربراہِ اہل شورائی سے اس باب میں مشورہ کرے کہ اسے قانون کا تحفظ کرنا چاہیے یا نہیں یا اگر کوئی طاقت مملکت کی حاکمیت کا سرچھین کرے تو اس کا مقابلہ کرنا چاہیے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف اقدام کرنے کے بارے میں شورائی کو بلا کر اس سے مشورہ لینے کی ضرورت محسوس ہی نہ کی بلکہ مانعینِ زکوٰۃ نے خود اپنے وفود بھیج کر بعض صحابہ کو حضرت ابوبکر سے گفتگو پر آمادہ کیا چنانچہ حضرت عمرؓ اور چند بدی صحابہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس خود چل کر گئے اور ان سے گفتگو کی۔ حضرت حسن بصری کے حوالے سے قاضی ابوبکر الجصاص نے یہ گفتگو اس طرح نقل کی ہے:

قالوا دعهم فانهم اذا استقروا لاسلام
 في قلوبهم وثبت، ادوا فقال والله لو
 منعوني عقالا مما اخذ رسول الله صلى الله
 عليه وسلم لقاتلهم عليه وقاتل رسول الله
 صلى الله عليه وسلم على ثلاث شهادة
 لا اله الا الله واقام الصلوة واتي الزكوة
 وقال الله تعالى " فان تابوا واقاموا الصلوة
 و اتوا الزكوة فحوا سبيلهم " والله لا اسئل
 فوقهم ولا اقص دونهم - فقالوا له
 يا ابا بكر نحن نذكي ولا ندفعما اليك
 فقال لا والله حتى آخذها كما اخذها
 رسول الله صلى الله عليه وسلم -

انہوں نے کہا ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجیے
 جب ان کے دلوں میں اسلام بچتے ہو جائے گا تو یہ
 خود زکوٰۃ ادا کریں گے تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا خدا کی
 قسم اگر انہوں نے اس زکوٰۃ کی ایک قسط بھی روکی جو
 وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کرتے تھے تو میں ان
 سے ٹرونگا اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں
 کے لیے جنگ کی ہے یعنی لا الہ الا اللہ کی شہادت نماز
 کی اقامت اور زکوٰۃ کی ادائیگی نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد
 ہے کہ اگر وہ رمتند، تو یہ کریں اور نماز قائم کریں اور
 زکوٰۃ دیں تو ان کو چھوڑ دو۔ خدا کی قسم میں نہ اس سے کچھ
 زیادہ کا مطالبہ کرتا ہوں اور نہ اس سے کچھ کم پر راضی
 ہوں۔ تو انہوں نے کہا کہ ابوبکرؓ! ہم زکوٰۃ تو نکالیں گے

لہٰذا ان وقت مانعین کی سب سے پہلی بات یہ تھی کہ ان سے زکوٰۃ کی سب سے پہلی بات یہ تھی کہ ان کے ہونے کو کچھ نہیں۔

(احکام القرآن)

لیکن تم کو نہ دیں گے تو حضرت ابو بکرؓ نے کہا نہیں! خدا
کی قسم (میں راضی نہ ہوں گا) جب تک میں اسی طرح زکوٰۃ
وصول نہ کر لوں جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم وصول فرماتے تھے۔

حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی یہ گفتگو صحیحین اور نسائی وغیرہ کتب احادیث میں نقل ہوئی
یہ اس کی تفصیل جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا استدلال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی
اس حدیث سے تھا کہ

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے (وہ کچے لوگوں سے جن پر
تمام حجت ہو چکا تھا، جنگ کر ڈنگا یہاں تک کہ وہ لا الہ
الا اللہ کہیں تو جس نے لا الہ الا اللہ کہا اس نے اپنے
جان و مال کو مجھ سے بچا لیا۔ سوائے اس کے کہ لا الہ الا
الا اللہ اس کا تقاضا کرے اور اس کے دباطن کا حساب
اللہ پر ہے۔

اموت ان اقاتل الناس حتی یقولوا
لا الہ الا اللہ فمن قال لا الہ الا اللہ فقد
عمم منی نفسه وماله الا بحقه وحسابه
علی اللہ۔

لیکن حضرت ابو بکرؓ نے جب وہ حدیث بیان کی جس کا پہلے ذکر آچکا ہے اور قرآن کی مذکورہ آیت سے
استدلال کیا تو حضرت عمرؓ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔ علامہ عینیؒ نے بخاری کی تشریح میں لکھا ہے کہ غالباً
حضرت عمرؓ کو وہ حدیث اس سے قبل نہ پہنچی تھی جس میں زکوٰۃ ادا کرنے کو بھی تحفظ بیان و مال کا حق حاصل کرنے
کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔

پھر حضرت ابو بکرؓ نے بھی حضرت عمرؓ کی حدیث میں 'الا بجمہ' سے استدلال کر کے ان کو بتایا کہ اس
حدیث میں جو اجمال ہے اس کی تشریح دوسری حدیث کرتی ہے کہ حق سے مراد نماز اور زکوٰۃ ہے حضرت
ابو بکرؓ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

الیس قد قال اللہ بحقه ومن حقه
الصلاة والزکوٰۃ۔

کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے الا بحقه نہیں کہا ہے
نماز اور زکوٰۃ اس کے حق میں داخل ہیں

اس مسئلہ میں حضرت ابو بکرؓ کے جذبات نہایت شدید تھے۔ امام نسائیؒ نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ
کی گفتگو اس طرح نقل کی ہے۔

قال عمر يا خليفة رسول الله تألف
الناس ووافق بهم فقال رجوت نصرتك
وجئتني بخذلانك اجبارني الجاهلية
وخوارفي الاسلام !! انه قد انقطع الوحي
وتم الدين او ينقص وانا حي !!

حضرت عمرؓ نے کہا کہ آسے خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم
لوگوں کی تالیف قلب کیجیے اور ان کے ساتھ نرمی کا
بڑا واسطہ کیجیے تو حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا مجھے تم سے
مدد کی توقع تھی اور تم میرا ساتھ چھوڑنے کی اطلاع کے
آسے ہو۔ جاہلیت میں تو بڑے بہادر تھے۔ اسلام
میں آکر بڑول بن گئے ہو۔ دیکھو وحی کا سلسلہ منقطع
ہو چکا ہے اور دین مکمل ہو گیا ہے۔ تو کیا میرے جیتے
جی اس میں کمی کی جا سکتی ہے۔

حضرت ابو بکرؓ کے ان ایمان افروز جذبات اور اس مضبوط استدلال کو سن کر حضرت عمرؓ نے اپنی رائے
تبدیل کر دی چنانچہ بخاری اور دیگر کتب صحاح میں ہے۔

قال عمر فوالله ما هو الا ان رأيت
ان قد شرح الله صدر ابي بكر للقتال ففقت
انه الحق -

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ میں سمجھ گیا کہ
اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکرؓ کو جنگ کرنے کے لیے کھینچ
کر دیا ہے تو میں نے سمجھ لیا کہ یہ فیصلہ حق ہے۔

اس بارے میں قاضی ابو بکر الجصاص نے نہایت فیصلہ کن تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

هذا الذي فعله ابو بكر في ما نعى
الزكوة بموافقة الصحابة اياها من غير
خلاف منهم بعد ما تبينوا صحة رأيه -

حضرت ابو بکرؓ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف جو قدم
اٹھایا وہ صحابہ کی مکمل تائید اور ان کی ادنیٰ مخالفت
کے بغیر اٹھایا کیونکہ انہوں نے آپ کی رائے کی صحت
کو تسلیم کر کے آپ کی مکمل تائید کی تھی۔

مذکورہ بالا سطور سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ امیر اور خلیفہ اہل شوریٰ کی رائے کا پابند
ہے۔ اسے اپنے تمام فیصلے شوریٰ کے مشورے سے کرنے چاہئیں۔ البتہ انتظامی امور اور تہذیبی قانون کے
سلسلہ میں امیر جو اقدام کرے اس کے لیے پیشگی مشورہ لینا ضروری نہیں۔ وہ بامیہ منظوری ایسے اقدام
کر سکتا ہے لیکن وہ اپنے تمام اقدامات کے لیے اہل شوریٰ بلکہ عاتقہ المسلمین تک کے سامنے جوابدہ ہے۔